مجسمۂ انسانیت

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَ الْمُرْسَلِیْن وَ آلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْن۔

وہ خصوصیات جو کسی انسان کو بلند نقطۂ انسانیت پر پہنچانے کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں، ان کی دو قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ایک خصوصیات داخلی، دوسرے خصوصیات خارجی۔

داخلی خصوصیات میں انسان کا حسب و نسب، کسی خاص خاندان سے تعلق رکھنا، خاص آباء اجداد کی نسل سے ہونا، جو مخصوص صفات وروایات کے حامل ہوں، یہ ایک انسان کے کمال کا باعث ہیں۔

جانے دیجئے اس اصول کو، جسے بہت سے لوگ آج تسلیم کر رہے ہیں اور وہ ''توارث صفات'' ہے، یعنی نفسانی صفات بھی بطور وراثت اولاد کی طرف منتقل ہوتے ہیں، اور اس کا تجربہ انسان تو انسان، حیوانوں تک میں ہوا ہے، چنانچہ ادنیٰ قسم کے حیوان کو، اعلیٰ قسم کی طرف منتقل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ اس نسل کے تعلقات ازدواجی میں ترقی کا لحاظ رکھا جائے، اگر برابر اچھی نسل کے افراد اس سلسلہ میں آتے رہیں تو رفتہ رفتہ اس کے نقائص دور ہو کر وہ نسل اعلیٰ قسم کی ہو جائے گی۔ انسان بھی طبعی خصوصیات کے لحاظ سے جب اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، تو کیوں نہ اس میں بھی یہ اصول درست ہو، پھر یہ کہ اخلاق و اوصاف نفسانی بھی اکثر تابع مزاج ہوتے ہیں، اور یہ طب میں بھی ثابت ہے کہ مزاجی خصوصیات اولاد کی جانب منتقل ہوتے ہیں، خیر جانے دیجئے اس کو، پھر بھی یہ ہے کہ انسان کو لاج ہوتی ہے اپنے باپ دادا کے طرز، طریقہ، اصول اور مسلک کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر وہ غلط باتوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا، صرف اس دلیل سے کہ ہمارے باپ دادا ان کے پابند تھے۔ پھر اگر آباء واجداد اچھی صفتوں کے حامل ہوں، تو اولاد کو ان صفتوں کے ساتھ الفت ضرور ہونا چاہیے، اس کا بھی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک انسان کا کسی کامل خاندان، اور بلند انسانی طبقہ میں پیدا ہونا، اس انسان کی بلندی کا ایک مستقل باعث اور سبب ہے۔

خارجی خصوصیات کو ہم تین قسموں میں درج کر سکتے ہیں۔

(۱) تعلیم و تربیت، کیونکہ ایک پست طبقہ کا آدمی بھی اگر اچھی تعلیم و تربیت پا جائے تو بسا اوقات وہ بلند ہو جاتا ہے۔

(۲) ماحول۔ تعلیم و تربیت تو زیادہ تر انسان کی زندگی کے ابتدائی دور سے متعلق ہے، لیکن ماحول ایسی چیز ہے جو ابتدائے عمر سے آخر تک ایک انسان کے ساتھ رہتا ہے، اور اس کی زندگی کے ہر حصہ میں اثر انداز ہوتا ہے۔

(۳) وہ واقعات و تجربات اور مشاہدات جنھیں انسان نے دیکھا، جن کا اسے سابقہ پڑا ہے، اور زندگی کے مختلف دوروں میں اسے جن سے گزرنا پڑا ہے، اس حیثیت سے انسان کا کمال اس وقت زیادہ ظاہر ہوتا ہے، جب انسان کو متضاد حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہو، اور اس وقت اسے متضاد طرز عمل اختیار کرنا پڑے ہوں۔ کیونکہ انسانی جذبات ہمیشہ یک طرفہ ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص غصہ ور ہے، تو اسے ہمیشہ غصہ کی بات پر غصہ آجائے گا، اور غصہ میں وہ کچھ نہ کچھ کر گذرے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ بعض وقت بہت قابل تعریف ہو، مثلاً کوئی مظلوم اسے مدد کے لئے پکارے، اور ظالم کی زیادتی کو دیکھ کر اس شخص کو غصہ آجائے،

اس وقت اس کے ہاتھوں مظلوم کی مدد ہوگی، مگر بہت ممکن ہے کہ بعض اوقات اس کا غصہ خراب نتائج بھی پیدا کرے، اور اس کے ہاتھوں فتنہ وفساد پیدا ہو، اور امن عالم کو صدمہ پہنچے، یہ شخص خود ہلاک ہو اور دوسرے کے ہلاک کرنے کا باعث ہو۔ یہ صرف اس لیے کہ اس کے اقدامات سب غصہ کے ماتحت ہوتے ہیں، اس لیے اس کے نتائج میں دورنگی نہیں پیدا ہوسکتی۔

اب دیکھئے، ایک دوسرا شخص ہے، جو فطرتاً حلیم اور متحمل واقع ہوا ہے، اس کا طرز عمل اکثر اوقات قابلِ تعریف ہوتا ہے، ایک ایسے موقع پر جب کسی دوسرے کو غصہ آجائے یہ خاموشی اختیار کرتا ہے، اور اس کی خاموشی سے ایک بڑا فتنہ فرو ہوجاتا ہے، کیا کہنا اس کی اس برمحل خاموشی کا، مگر یاد رکھیئے کہ یہ خاموشی کبھی جرم بن جائے گی، اس وقت جب اس خاموشی سے ظالم کی ہمت افزائی ہورہی ہو، اور مظلوموں کا گلا کٹ رہا ہو۔ یہ انسان اپنی خاموشی سے اس وقت تعریف کے بجائے، مذمتوں کا مستحق ہوگا۔ یہ نتیجہ ہے اس کا کہ اس کی خاموشی طبیعت کی کمزوری، اور سردی کا نتیجہ تھی، اس لیے وہ ہرحال میں یکساں رہے گی، اور اس میں تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔

انسانیت کا کمال مضمر ہے، تضاد اور نیرنگی میں، وہی انسان جو غصہ کے موقع پر بڑا ہی غصہ ور معلوم ہوتا ہے، خاموشی کے محل پر اس طرح خاموش ہوجائے گویا اس میں غصہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ ہوگا انسان کامل۔

تمام جرائم کا سرچشمہ جذبات نفس ہیں، اور جذبات میلان طبعی کا نتیجہ ہوتے ہیں، جو یک طرفہ ہی ہوں گے، مگر انسانیت نام ہے، جذبات کی مخالفت کا، وہاں جذبات، قوت عاقلہ کے ماتحت ہوجاتے ہیں، ممکن ہے کہ کبھی عمل جذبۂ نفس کے مطابق ہو، مگر وہ صرف اس لیے کہ عقل کا فیصلہ بھی اسی کے موافق ہے اور اگر محل و موقع کا تقاضا اس کے خلاف ہو، تو عمل بدلا ہوا اور طریق عمل مختلف نظر آئے۔ اس کا نام ہوگا فرض شناسی، اور یہی ہوگا جوہر انسانیت، اور اس جوہر میں جلا پیدا ہوتی ہے، یا اس کی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے ان ہی مواقع سے، جو کسی انسان کو متضاد شکل میں درپیش ہوں، اور پھر متضاد طریقے اسے اختیار کرنا پڑیں۔

اس صورت میں اس کے حکیمانہ تدبر کی رفعت، اس کے طبعی رجحانات، اور نفسانی جذبات پر پورے طور سے ثابت ہوتی ہے، اور وہ پتہ دیتی ہے اس کا کہ وہ کمال انسانیت کے نقطہ پر کس درجہ تک فائز ہے۔

میں دیکھتا ہوں تو کربلا کا انسان حسینؑ بن علیؑ ان تمام خصوصیات میں بڑے بلند نقطہ پر نظر آتا ہے۔

پہلا سبب کیا تھا! خاندانی خصوصیات، حسینؑ کے خاندانی خصوصیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ خلیل خدا سے۔ یہ ہستی بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ یہود، نصاریٰ اور مسلمان، سب ان کو تسلیم کرتے ہیں، اور اسلام کے مورث اعلیٰ یہی حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ ان کے دو بیٹے تھے اسحٰقؑ اور اسمٰعیلؑ۔

اولاد اسمٰعیلؑ کو حرم خدا کی قربت کی وجہ سے عرب میں امتیازی خصوصیت اور مرکزیت حاصل ہوئی، اولاد اسمٰعیلؑ میں نضر بن کنانہ کی اولاد، قریش کے نام سے موسوم ہوئی، قریش کا امتیاز تمام قبائل عرب میں تسلیم کرلیا گیا، اور پھر قریش میں ہاشم کو خصوصیت خاص حاصل ہوئی، بنی ہاشم تمام قریش میں دینی اور دنیوی اعتبار سے مخصوص اہمیت کے مالک تسلیم کیے گئے، عبدالمطلب کو سیّدالبطحا کا لقب دے کر گویا تمام اہل حجاز نے ان کی سرداری اور بلندی تسلیم کرلی، اور ان کے بعد ان کی اولاد میں یہ لقب برقرار رہا۔ یہ سیادت، نہ صرف امور دنیوی میں تھی، بلکہ جو مقدس شعائر تھے ان کی حفاظت وحمایت اور ذمہ داری کے تمام فرائض اولاد ہاشمؑ سے متعلق رہے، اور اس کے ساتھ دین خدا، حرم خدا اور شعائر الٰہیہ پر جو کوئی مصیبت پڑی تو سخت وقت میں یہی خاندان کام آیا۔ عبدالمطلب کے دو فرزند تھے، عبداللہ اور ابوطالب مگر عبداللہ کا انتقال عبدالمطلبؑ کی زندگی میں ہوگیا، اس لئے جتنی ذمہ داریاں عبدالمطلبؑ کے متعلق تھیں، ان کی وفات کے بعد ابوطالبؑ کی طرف منتقل ہوئیں، اب ابوطالبؑ تبرکات

ابراہیمؑ کے حامل بھی تھے، متروکات اسمٰعیلؑ کے وارث بھی۔ حرم کے متولی اور محافظ بھی تھے، اور اس ملت ابراہیمیہ کے ورثہ دار بھی، جس کا نام تھا اسلام، اور جس کا سنگ بنیاد خلیلؑ نے رکھا تھا۔

عبداللہ کے فرزند تھے حضرت محمد مصطفیٰؐ جو اسلام کے پیغمبر ہیں، اور آپ بھی ابتدائے عمر سے ابوطالبؑ کی پرورش میں رہے، کیونکہ آپ کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ابوطالبؑ نے اس ذمہ داری کو جس طرح پورا کیا ہے، وہ دنیا کی تاریخ میں ایک یادگار چیز ہے، انھوں نے اپنی اولاد کو رسول اسلامؐ پر جاں نثاری کا سبق دیا، اس وقت جب شعب ابی طالبؑ میں محصور تھے، تو اس خوف سے کہ کہیں شب کو رسولؐ قتل نہ کر دیئے جائیں، ابوطالبؑ آپ کی جگہ پر اپنے بیٹوں میں سے ایک ایک کو باری باری سلا دیتے تھے، اور اس طرح گویا سکھلاتے تھے کہ رسولؐ پر کوئی وقت پڑے تو یوں جان فدا کر دینا۔

قدرت نے اس عبداللہ کے یتیم اور ابوطالبؑ کے پروردہ کو یہ عزت دی کہ اس کو اپنے دین کا حامل بنایا، اسلام کا کلمہ ان کی زبان سے پہونچایا، اس پر دنیا ان کی دشمن ہوگئی، مگر رسولؐ نے اس سلسلہ میں ہر مصیبت کو برداشت کیا، اور اسلام کی تبلیغ کرتے رہے، یہاں تک کہ سب آپ کے مخالف ہو گئے، اور قتل پر متفق ہو گئے۔ ابوطالبؑ بھی مر چکے تھے جو آپ کے محافظ تھے، مجبوراً آپ کو رات کے وقت مکّہ سے جدا ہونا پڑا، اس موقع پر ابوطالبؑ کے فرزند علیؑ ہی کی ذات تھی، جسے آپ نے دشمنوں کی تلواروں کے حلقہ میں، اپنے بستر پر لٹا دیا تھا کہ جاں نثاری آپ بچپن میں باپ کے کہنے سے کر چکے تھے، اور اسے آپ نے اس متیقن خطرہ کے موقع پر عمل کر کے دکھلا دیا، کہنے دیجئے کہ علیؑ نے اس خطرہ میں اپنے تئیں ڈال کر اپنے کو فدیۂ اسلام بنا دیا، یہ اور بات ہے کہ خدا نے حفاظت کی اور علیؑ کی جان سالم رہی۔

رسول اللہؐ کو خدا نے ایک بیٹی دی تھی، جس کا نام تھا فاطمہؑ زہرا۔ رسولؐ نے اپنی ہجرت کے بعد ہی اس اپنی بیٹی کا عقد علیؑ ابن ابی طالبؑ کے ساتھ کر دیا، انہی سے دو فرزند ہوئے، ایک کا نام تھا حسنؑ اور دوسرے کا نام تھا حسینؑ، اب کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ حسینؑ کی نگاہ میں اپنے آباؤ اجداد کے کتنے روایات تھے، اور وہ کون سا سلسلۂ عزّت و شرافت، سلسلۂ صدق وحقانیت، سلسلۂ ایمان و روحانیت تھا جس کی اس وقت آخری کڑی یہ حسینؑ تھے، کیا نسبی معیار کے لحاظ سے اس سے زیادہ بلندی کی انسانی کمال کے لیے توقع کی جاسکتی ہے؟

دوسرا سبب

تعلیم و تربیت

حسینؑ کی تربیت رسولؐ نے کی، جو دنیا کے لیے معلم اخلاق تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ آپ پر سب سے پہلا فرض اپنی اولاد کی تربیت کا عائد ہوتا تھا۔ حسینؑ نے خلق عظیم کی آنکھیں دیکھیں، خلق عظیم کی گود میں رہے، خلق عظیم کے ہاتھوں پر پلے۔

رسولؐ اپنی اولاد کو اس اسلام کی حفاظت کا ذمہ دار بنا رہے تھے، کہ جس کی وہ تعلیم و تلقین میں مصروف تھے، اس لیے ان کی تربیت کا خاص پہلو یہ تھا کہ وہ بچوں کو اسلام کے متعلق ان کی ذمہ داری کا احساس پیدا کراتے رہیں، اس کے لیے بھی اقوال تھے، اور افعال بھی تھے۔ اقوال میں، ان کو قرآن کا ہمراہی قرار دینا، یہ بتانا کہ یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، اور اعمال میں اس موقع پر کہ جب نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ ہو رہا تھا، ان کو اپنے ساتھ لے جانا۔ یہ سمجھنا، بالکل غلط ہے کہ رسولؐ کی دعا آمین کی محتاج تھی، مگر ایک طرف تو آپ دنیا کو بتلا رہے تھے کہ دیکھو، اگر حق و باطل کا مقابلہ ہو، تو خالص حق کے مجسمے یہ ہیں، دوسری طرف ان کو احساس پیدا کرا رہے تھے، کہ دیکھو اگر اسلام پر کوئی وقت پڑے، تو مجھے تم ہی سے امید ہے، اس وقت میں موجود ہوں، میں خود تمہیں لے جا رہا ہوں، اور کسی وقت میں موجود نہ ہوں گا تو تم خود اٹھ کھڑے ہونا۔ حسینؑ کے گوشت اور خون کو، اپنا گوشت اور خون کہا تھا، اس کے بھی یہ معنی ہو سکتے ہیں، کہ اے حسینؑ اگر اسلام پر کوئی وقت پڑے، تو اس گوشت کو اپنا گوشت اور اس خون کو اپنا خون نہ سمجھنا۔ اسے میرے اسلام پر قربان کر دینا۔

یہ تھی وہ تربیت جو حسینؑ کو حاصل ہوئی تھی۔

تیسرا سبب

ماحول

کیا پوچھنا حسینؑ کے ماحول کا۔ وحی کی صدا قرآن کی آواز، رسولؐ کے جہاد، اور علیؑ کے مجاہدانہ کارنامے۔

یہ ہے بچپنا۔ جوانی میں باپ کو خانہ نشین ضرور دیکھا، مگر یہ برابر نظر آیا کہ جب اسلام کے لیے کوئی سخت موقع ہوا، کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوا، کوئی اہم مشورہ، فوراً اسلام کے مفاد کے لئے فائدہ پہونچانے کو تیار ہو گئے۔ ذاتی اغراض، خواہش نام و نمود، زمانے کی بے التفاقی کا کبھی اس معاملہ میں خیال نہ کیا۔ ہاتھ میں تلوار، بازوؤں میں طاقت ہوتے ہوئے، کبھی شمشیر آزمائی کا ارادہ نہ کیا، حقوق تلف ہوتے دیکھے خاموشی اختیار کی، اس لیے کہ اسلام کو نقصان نہ پہونچے۔ جب مسلمانوں نے خود سے آ کر اقتدار کی پیشکش کی، اور آپ کو اسے ماننا پڑا، تو دیکھا کہ حقانیت کی حفاظت کے لئے، اور حمایت باطل سے علیحدہ رہنے کے لئے، اور اسلام کے آئین واصول کو برقرار رکھنے کے لیے، علیؑ نے حاکم شام کے ساتھ ذرا بھی چشم پوشی، رواداری، اور سہل انکاری کو جائز نہیں سمجھا، ہزاروں مصیبتیں برداشت کیں، مگر ایک منٹ کے لئے اس کو گوارا نہ کیا کہ آپ معاویہ کی حکومت کو ملک شام پر منظور کر لیں۔

غرض یہ ماحول تھا، جس میں حسینؑ نے زندگی کے دن گزارے، ہمیشہ یہی رہا کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہر بات میں اسلام کا مفاد سامنے رکھو۔ حق اپنا ضائع ہو کچھ نہ بولو، اسلام کی خاطر دنیا کنارہ کشی کر لے، اور دوسرے بے جا اقتدار قائم کر لیں، خاموش رہو، اسلام کی خاطر راحت و آرام میں خلل پڑے، مگر یہ سب اختیار کر لو، اسلام کی خاطر اس ماحول کا قطعی نتیجہ یہ تھا کہ جان بھی جارہی ہو، اولاد بھی کام آرہی ہو، مال و اسباب بھی لٹ رہا ہو، تو اس سب کو گوارا کر لو اسلام کی خاطر۔

چوتھا سبب

واقعات و تجربات، اور متضاد حالات میں متضاد طرز عمل اختیار کرنے کے مواقع۔

اس حیثیت سے حسینؑ کو جتنے مختلف ادوار سے گزرنا پڑا۔۔۔کو گزرنا پڑا ہوگا۔

سات برس کی عمر حسینؑ نے اپنے نانا رسولؐ اللہ کی زندگی میں گزاری، یہ بچپنا تھا، جو بچپنے ہی کے لائق راحت آرام دلجوئی اور خاطر داری میں گزرا، اس کے بعد آیا علیؑ بن ابی طالبؑ کا زمانہ، حسینؑ نے دیکھا، سمجھا، اور محسوس کیا کہ زمانہ بدل گیا۔ ڈیوڑھی کی رونق سناٹے سے تبدیل ہوگئی، جو ہر وقت کے آنے جانے والے لوگ تھے، اب دور دور تک نظر نہیں آتے، یہ بھی سنا کہ میرے باپ جس حق کو اپنا سمجھتے ہیں، اس حق پر دوسروں کا قبضہ ہے، اس موقع پر بچوں اور نوجوانوں کے جذبات عجیب تلاطم خیز ہوتے ہیں، پھر حسینؑ اسی زمانہ میں بھرپور جوان ہوئے، اور چونتیس (۳۴) برس کی عمر تک پہونچے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ زمانہ صبر وسکون عافیت اندیشی اور انجام بینی کا ہوتا ہے، اور کیا انسانی جوش و ولولہ اس موقع پر مصالح کی بندش آسانی سے گوارا کرتا ہے مگر حسینؑ کو باپ کے اختیار کردہ مسلک کی پابندی لازم تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس زمانہ میں کوئی فعل انھوں نے نظم وضبط کے خلاف کیا ہو۔

بلکہ اس وقت جب تیسرے دور میں خلیفہ وقت محصور تھے، اور حملہ آوروں نے پانی بند کر دیا تھا، تو حسنؑ اور حسینؑ کو علیؑ بن ابی طالبؑ نے پانی پہنچانے پر مامور کیا تھا، اور کہہ دیا تھا کہ اگر اس سلسلہ میں جنگ بھی کرنا پڑے تو کر لینا۔ باپ کے حکم کی اطاعت تھی کہ حسینؑ پانی لے کر گئے، اور پوری قوت سے کام لے کر پانی پہنچا دیا، کیا عام طبعی جذبات اور رجحانات کا بھی تقاضا یہی ہوتا ہے؟

تیسرا دور وہ آیا، جب حضرت علی بن ابی طالبؑ سریر خلافت پر متمکن ہوئے، اب بغاوتیں برپا ہوگئیں، اور علی بن ابی طالبؑ کو جنگ کرنا پڑی۔

اس سلسلہ میں جنگ جمل ہوئی، اور صفین، اور نہروان، اس وقت حسینؑ میدان جنگ میں تلوار لے کر اپنے باپ کی حمایت میں مصروف جہاد ہو گئے۔

حسینؑ کی عمر پینتیس چھتیس برس کی ہے، اور بے شک اس عمر کا ولولہ جہاد کا متقاضی ہے، مگر صفین میں قرآن نیزوں پر بلند ہوتے ہیں، علوی فوج میں اختلاف ہوجاتا ہے، اور علی بن ابی طالبؑ موقع شناسی کی بناء پر التوائے جنگ کا حکم دیتے ہیں۔ لیجئے حسینؑ کی تلوار بھی نیام میں چلی جاتی ہے، کیا جوانی کی عمر کا جوش آسانی سے ترک جنگ پر آمادہ ہونے دے سکتا ہے، ایک ایسے موقع پر، جبکہ فتح بالکل سامنے تھی، اور مالک اشترؒ کی بہادری کا جذبہ، بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدل رہا تھا، مگر یہاں جذبات سے تو کام نہ تھا، فرض کا احساس، حسینؑ کے سر کو جھکا دیتا ہے، معلوم ہوتا ہے، اب تلوار میں باڑھ ہی نہیں، یہاں تک کہ التوائے جنگ کے معاہدہ پر، حسنؑ اور حسینؑ دونوں بطور گواہ دستخط کردیتے ہیں اس کے بعد امیر المومنینؑ شہید ہوتے ہیں امام حسنؑ جانشین ہوئے اور اپنے باپ کے دشمن معاویہ سے جنگ پر تیار ہوئے، حسینؑ بھی بھائی کے ساتھ جہاد پر مستعد ہیں، حالات ایسا پلٹا کھاتے ہیں کہ امام حسنؑ کو معاویہ کے ساتھ صلح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، یاد رکھیئے کہ یہ موقع دوسرا ہے، باپ کا سا تفوق بھائی کو عام انسانوں کی نگاہ میں حاصل نہیں، مگر حسینؑ تو اپنے بھائی کو پیشوا تسلیم کیئے ہوئے تھے، حسینؑ اسی راستہ پر ہیں، جو حسنؑ کا راستہ ہے حالانکہ ساتھیوں میں شورش ہے، وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح حسینؑ جنگ پر تیار ہوجائیں۔

مگر وہ فرض شناس انسان کہتا ہے کہ ہم نے صلح کرلی اور ہم اس کے پابند ہیں، دس برس حسنؑ کی زندگی میں گزارے جاتے ہیں، دس برس حسنؑ کے بعد گزارے جاتے ہیں، اور وہی خاموشی کا مسلک قائم رہتا ہے، وہ حسینؑ جس نے اس کے بعد کربلا میں دکھلا دیا کہ اس کے سینہ میں کون سا دل، اور پہلو میں کون سا جگر ہے، وہ اس تمام طولانی مدت میں ہزاروں ناگوار واقعات کے باوجود یوں خاموش رہتا ہے جیسے اس کے سینہ میں دل، اور دل میں حوصلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

کیا کم ہے یہ بات کہ حسنؑ کو زہر دے دیا جائے، کیا کم ہے یہ بات کہ حسنؑ کو روضۂ رسولؐ میں دفن نہ ہونے دیا جائے، کیا کم ہے یہ کہ حسنؑ کے جنازہ پر تیر چلائے جائیں، مگر حسینؑ ان تمام باتوں پر خاموش رہیں۔ تلوار نیام سے نہ نکالیں، کیا اس سے بڑھ کر جذبات پر قابو کی کوئی مثال ہوسکتی ہے؟

لیجئے وہ وقت آ گیا کہ یزید طالب بیعت ہوا۔ اب وہی خاموش انسان یہ کہتا ہے کہ بیعت تو میں نہیں کروں گا۔ یہ حسینؑ نہیں کہہ رہے تھے، حسینؑ کے خاندانی خصوصیات، حسینؑ کی تعلیم وتربیت، حسینؑ کا ماحول، اور حسینؑ کا ضمیر، سب متفق ہوکر آواز دے رہے تھے، کہ یزید سے بیعت تو نہ ہوگی، کیونکہ اس بیعت سے اسلام فنا ہی ہوجائے گا، شریعت اسلام فراموش ہوجائے گی، اور آئین اسلام میں تبدیلی ہوجائے گی۔

''بیعت نہیں کروں گا'' کہا، اور وطن چھوڑ دیا، مکّہ بسایا، وہاں ستائے گئے، اسے چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے، عراق کی طرف چلے، فوج آ گئی روک لیا، کربلا میں اتر پڑے، چاہتے ہیں خیمے فرات پر برپا کریں، مخالف فوج، وہی فوج جسے حسینؑ ابھی پانی پلا چکے تھے، وہ حسینؑ کا پانی کے پاس رہنا گوارا نہیں کرتی۔

''نہیں'' امیر کا حکم ہے کہ آپ کے خیمے ریتی پر برپا ہوں'' اصحاب بگڑتے ہیں، چاہتے ہیں کہ اس بات پر لڑیں، حسینؑ کہتے ہیں، نہیں، نہیں، لڑو نہیں، ہم خیمے یہاں سے ہٹائے لیتے ہیں۔ ریتی پر خیمے برپا کردو۔ فوجیں آنے لگیں دشمن نے گھیر لیا۔

حسینؑ امن وصلح کی کوشش شروع کرتے ہیں، ناواقف لوگ سمجھتے ہوں گے کہ یہ دل کی کمزوری کا نتیجہ ہے، آج تک یہی سمجھتے، اگر عاشور کا دن نہ آتا، اور حسینؑ کربلا کے ذرّے ذرّے کو اپنی بہادری، استقلال، اور تحمل کا گواہ نہ بنا دیتے۔

صلح کی گفتگو کامیابی کے قریب پہونچتی ہے، مگر ابن زیاد اسے ختم کردیتا ہے، ''یا بیعت یا قتل'' اور حسینؑ بیعت کو پہلے ہی کہہ چکے تھے، کہ نہیں، وہ اگر جذبات کی بنا پر فیصلہ ہوتا، تو شاید اب خوف کے جذبہ سے بدل جاتا، نہیں وہ تو حسینؑ کے ضمیر کا فیصلہ تھا، اور دل ودماغ کا سمجھوتہ تھا، اس میں تبدیلی کی گنجائش نہ تھی۔

اب تو بس ایک ہی صورت ہے قتل، حسینؑ ساتھیوں سے کہتے ہیں چلے جاؤ میں اکیلا اس مہم کو سر کرلوں گا۔ ساتھی کہتے ہیں، نہیں، ہم ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

اچھا تو پھر آؤ عاشور کی صبح، اب تو ایک مرنے والے کو انتظار کی ضرورت نہیں، مگر وہاں تو فرائض کی تکمیل ہو رہی تھی۔

کہیں دشمن کی جماعت میں کوئی ناواقف نہ ہو، کوئی ہدایت کا تشنہ نہ ہو۔

لیجئے حسینؑ نے اتمام حجت بھی کرلی، وہ تقریر جس میں اپنی صفائی کے دلائل پیش کیے تھے، ہاں ہاں حسینؑ کی تقریر بے اثر نہ تھی، حُر سمجھا اور حسینؑ کی طرف آ گیا۔

دشمن نے تیروں کی بوچھار کر کے اعلان جنگ بھی کردیا، حسینؑ میدان قربانی میں ہیں۔ مگر اپنی جان کی قربانی تو کوئی بات نہ تھی، اپنے سے وابستہ ہر فرد کو خود قربان کردیا۔

ایک بھی جب تک باقی رہا، حسینؑ نے جہاد کا ارادہ نہیں کیا، معلوم ہوتا ہے اب بھی نفس کا سکون ختم نہیں ہوا ہے۔ مراحل عمل ہیں جو ترتیب کے ساتھ طے ہو رہے ہیں، کوئی گھبراہٹ کا اقدام، اور بے چینی کا عمل نہیں ہے، لیجئے کوئی نہیں رہا، وہ جو بیس (۲۰) برس تک خاموش رہا، وہ جو نو دن تک صلح کی نرم شرطیں پیش کرتا رہا، وہ جو صبح سے اب تک دوستوں اور عزیزوں کو قتل ہوتے دیکھتا رہا، اور تلوار نیام سے نہ نکالی، اب جب کہ کوئی نہیں رہا ہے، جبکہ کمر بھی شکستہ ہے، آنکھوں کا نور بھی رخصت ہو چکا ہے، بے کسی، بے بسی تین دن کی پیاس اور صبح سے اس وقت تک کی تمازت آفتاب کو برداشت کیئے ہوئے، اب وہ جہاد پر تیار ہوتا ہے، وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کو دشمن کے سپرد نہیں کردیتا، کیونکہ یہ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے، اسے حفاظت خود اختیاری کے لیے مدافعانہ جہاد فرض ہے، وہ تلوار نیام سے کھینچتا ہے۔

اتنی جنگ کرتا ہے، جسے تاریخ نے نمایاں الفاظ میں لکھنا ضروری سمجھا ہے۔ آخر کو قربانی کی تکمیل ہوجاتی ہے، حسینؑ دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں، مگر ان کی عظیم انسانیت، آج تک عالمِ امکان سے کلمہ پڑھوائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

یہ تھا وہ مجسّمۂ انسانیت جس کی مثال تاریخ دنیا میں ملنا ناممکن ہے۔

✿✿✿

اے اہل فلسطین

ڈاکٹر عظیم امروہوی، دہلی

حق والے کسی ظلم سے گھبراتے نہیں ہیں
سر اپنا کٹانے سے بھی کتراتے نہیں ہیں
ظالم کو نظر میں وہ کبھی لاتے نہیں ہیں
ہوتی ہے انھیں حق پہ فدا ہونے سے تسکین
اے اہل فلسطین سنو اہل فلسطین
آلام ومصائب سے نہ ہونا کبھی غمگین

سینوں میں تمہارے جو ہے ایمان کی دولت
اور لب پہ تمہارے ہے جو قرآن کی دولت
اور سب سے بڑی ہے یہ مسلمان کی دولت
کیوں سایہ فگن تم پہ بھلا ہوں گے نہ یٰسین
اے اہل فلسطین سنو اہل فلسطین
آلام ومصائب سے نہ ہونا کبھی غمگین

سولی پہ بھی حق بات سنانا ہے ضروری
خطرات سے اسلام بچانا ہے ضروری
حق کے لئے سر اپنا کٹانا ہے ضروری
یہ حکم ہے اللہ کا یہ ہے سبق دین
اے اہل فلسطین سنو اہل فلسطین
آلام ومصائب سے نہ ہونا کبھی غمگین

وہ جن کے دلوں میں ہے بھرا بغض وعداوت
وہ جن کے ہے سینوں میں ہمیشہ سے ہی نفرت
ہے جن کے مزاجوں میں غرور اور رعونت
خود وقت ہی اک روز کرے گا انھیں تلقین
اے اہل فلسطین سنو اہل فلسطین
آلام ومصائب سے نہ ہونا کبھی غمگین